بھارتی دہشت گردی کا شکار، ریاست حیدرآباد دکن اور کشمیر

زیبا افتخار*

ABSTRACT:

Hyderabad Deccan, a state located in the southern region, was one of the key states in the Subcontinent. Its significance emanated from its rich cultural heritage which gives Hyderabad Deccan a prominent place amongst all states of the subcontinent. Muslims ruled over this Hindu majority state for over seven hundred years since 14 AD. The downfall of the state began mutely back in ninteenth century with the arrival of English in the Subcontinent and was concluded with their departure. The poignant and unexpected demise of the largest and most self-reliant state was not only the fall of a piece of land rather a collapse of culture, tradition and language of a whole nation. One of the most important reason of this downfall was the aggression of India after the partition of the subcontinent.

At the other far end of India, located a beautiful state of Kashmir in the picturesque valley of Himalayas. Here, unlike Hyderabad, Hindus ruled over Kashmir despite a Muslim majority in the territory. At the time of partition, there were about one hundred and forty autonomous states that were given the right to decide, based on the consent of the residents and keeping in account the geographical limitations, either to choose one of the two newly formed states or to be purely sovereign and independent states. However, these rights were never practiced; the smaller and vulnerable states, even those with a Muslim majority, were forcibly merged with India. Kashmir and Hyderabad Deccan were the only two large and determined states which decided to stay independent. Whereas, the Muslim population of Kashmir wanted their land to be a part of the newly formed Pakistan. Despite the choice of Hyderabad Deccan and Kashmir, India has not only taken over Hyderabad Deccan but has also seized the Kashmir region too.

The article shed light on the causes and the consequences of the downfall of Hyderabad Deccan. Similarly, it also argues that if the inclusion of Hyderabad Deccan as a part of India was justified on the basis of geographical proximity and the consent of the majority of population, how can the claim of Pakistan over Kashmir being rightfully in its territory be negated.

برصغیر پاک و ہند کی دو بڑی ریاستوں، ریاست حیدرآباد دکن اور ریاست کشمیر کے مابین تقابلی جائزہ یا مطالعہ کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ یہ دونوں ہی ریاستیں مجموعہ اضداد تھیں۔ برصغیر پاک و ہند کے نقشے میں یہ دونوں ریاستیں، ایک دوسرے سے مخالف، دو مختلف کونوں میں پائی جاتی تھیں۔ حیدرآباد برصغیر کے جنوب میں سطح مرتفع دکن میں واقع ہے جبکہ اس کے مخالف سمت یعنی برصغیر کے شمال مغربی گوشے میں کوہ ہمالیہ کی حسین وادیوں میں کشمیر واقع ہے۔ حیدرآباد دکن

* ڈاکٹر، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی　برقی پتا: zebaiftikhar@gmail.com

تاریخِ موصولہ: ۱۲/۲/۲۰۱۴ء

رقبے کے لحاظ سے سابق برطانوی عہد میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تسلیم کی جاتی تھی، جس کا کل رقبہ ۸۶۲۹۸ مربع میل تھا(۱) اور وہ ریاست کشمیر کے کل رقبے (۸۵۳۹ مربع میل) (۲) سے کم وبیش ۵۹ ۷۷ مربع میل زیادہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ ریاست حیدرآباد میں کشمیر جیسی دس ریاستیں سما سکتی تھیں۔

حیدرآباد دکن، تہذیب وتمدن کی اعلیٰ ومنفرد مثال تھا، علم وادب یہاں کی پہچان تھی، جبکہ کشمیر فطری سادگی پر تھا۔ حیدر آباد میں تیرھویں صدی کے آخر سے، یعنی سات سو سال سے مسلمان حکمران تھے (۳) جبکہ عوام کی اکثریت ہندو مذہب پر تھی اور مسلمانوں کا کل تناسب صرف دس فیصد تھا۔ اس کے برعکس کشمیر میں ہندو اور سکھ حکمران تھے جبکہ عوام کی اکثریت مسلمان تھی۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری (جو متحدہ برصغیر کی آخری مردم شماری تھی) کے مطابق مسلمان کل آبادی کا ۹۴ فیصد تھے اور ہندو اور سکھ چھ فیصد تھے۔ (۴) حیدرآباد دکن کے حکمران اور عوام دونوں ہی تقسیم ہند کے بعد آزاد حیثیت میں رہنا چاہتے تھے۔ جبکہ کشمیر کے مسلمان جو کل آبادی کا غالب حصہ تھے، پاکستان سے الحاق کے حق میں تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے فوری بعد جب ریاستیں ہندو دہشت گردی کا شکار ہونا شروع ہوئیں تو سب سے بڑی ریاست صرف پانچ دن کی فوجی کارروائی میں زوال پزیر ہوگئی، جبکہ ایک چھوٹی سی ریاست کشمیر اس وقت بھی ہندو عزائم کے سامنے ڈٹ گئی تھی اور آج نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنی آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہے، اور ہندو عزائم کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کھڑی ہے اور آج تک پاکستان سے الحاق کے حق میں ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ پاکستان آج تک کشمیر کے علاقے کو پاکستان میں شامل نہ کرا سکا۔ اتنے تضادات کے باوجود ان دونوں ریاستوں کے تاریخی حقائق کا تقابلی مطالعہ کرنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جا سکے کہ آیا وہ رویہ جو ہندوستان کی طرف سے ریاستوں کے انضمام کے لئے سامنے آیا تھا، درست تھا؟ یا وہ رویہ جو پاکستان تقسیم ہند کے بعد سے مسلسل اختیار کئے ہوئے ہے، وہی مناسب ہے؟ نیز یہ کہ نصف صدی سے زائد جاری اس جنگ کا کوئی منطقی انجام ہوگا بھی یا نہیں؟

ہندوستانی ریاستوں کی صورتحال

سلطنت دہلی کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے صوبائی بادشاہتوں کا خاتمہ کیا۔ مسلم ریاستیں پہلے ہی سے کم تھیں کیونکہ مسلم حکومت کے زمانے میں رجحان مرکزیت کی طرف ہی رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اورنگزیب کا انتقال ہوا تو کوئی مسلمان صوبائی تخت باقی نہیں رہا تھا۔ رہیں ہندو ریاستیں تو ان کے وجود کو باقی رکھنا مسلم حکمرانوں کے نزدیک قرین مصلحت تھا (۵)۔ لیکن اورنگزیب کی وفات کے بعد جو واقعات تواتر سے پیش آئے وہ نا قابلیت، کوتاہ بینی، اور غداری کی ایک طویل داستان ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر صوبائی حکومتیں قائم ہونے لگیں اور مسلمانوں کے زوال کے زمانے میں ہندوستان میں چھوٹی بڑی ریاستوں کی کل تعداد پانچ سو باسٹھ (۵۶۲) ہوگئی۔ یہ برصغیر کے کل رقبے کے نصف پر پھیلی ہوئی تھیں اور برصغیر کی ایک چوتھائی آبادی ان میں آباد تھی (۶)۔ انگریزوں کے یہاں آنے پر ان خودمختار ریاستوں نے جو

باہم دست و گریباں رہتی تھیں، انگریزوں کا راستہ صاف کیا۔ اوران بیرونی تاجروں کوان ریاستوں کے باہمی جھگڑوں میں دخل دے کر اپنی طاقت بڑھانے کا نادر موقع ہاتھ آ گیا۔

بڑی ریاستیں جن کی تعداد تقریباً ۱۴۰ (ایک سو چالیس) تھی، ان میں بنگال، کشمیر، پنجاب، اودھ، میسور اور حیدرآباد کی ریاستوں کو خصوصیت حاصل تھی۔ چھوٹی ریاستیں بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے باعث بہت جلد کمپنی کو خراج دینے پر آمادہ ہوگئیں، جس کے جواب میں ان کو تحفظ فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس بڑی ریاستوں نے خراج تو نہ دیا مگر وہ بھی اس امر پر مجبور ہو چکی تھیں کہ ریاست کی فوج کے افسر اعلیٰ، انگریز مقرر کئے جائیں۔ اس اقدام سے ایک طرف ریاستیں اپنے آپ کو انگریزوں کی فوجی کارروائی سے محفوظ خیال کرتی تھیں تو دوسری طرف انگریزوں کو بھی یہ اطمینان رہتا تھا کہ کوئی ریاست کبھی ان کے خلاف اٹھ کر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ یہ ریاستوں میں امن قائم رکھنے کی ایک کوشش تھی (۷)۔ لیکن ڈلہوزی کی ریاستوں کے الحاق کی حکمت عملی نے اس صورتحال کو سخت خراب کیا، سب سے پہلے ۱۷۵۷ء میں بنگال کا صوبہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا جس میں بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے (۸)۔ ۱۷۹۹ء میں میسور ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے ختم ہوا جبکہ ٹیپو سلطان اپنی مملکت کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے (۹)۔ میسور کے بعد مرہٹوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے سارے علاقے انگریزوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ۱۸۰۴ء میں مرہٹوں سے فارغ ہو کر انگریز دارلسلطنت دہلی کی طرف متوجہ ہوا اور مغل شہنشاہ کو ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے صرف لال قلعہ تک محدود کر دیا (۱۰)۔ ۱۸۴۷ء میں سندھ اور پھر صرف دو سال بعد یعنی ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا وسیع علاقہ بھی انگریزوں کے اقتدار کی بھینٹ چڑھ گیا (۱۱)۔ یہ صورتحال یعنی ریاستوں کے الحاق کی پالیسی ۱۸۵۷ء تک برقرار رہی اور پھر جب جنگ آزادی کا خونیں واقعہ پیش آیا تو انگریزوں کو اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ ملکہ وکٹوریہ نے جنگ آزادی کی ناکامی پر اپنے بیان میں مقامی ریاستوں کو زندہ رہنے کا حق دے دیا بلکہ ان کی بقا کو برطانوی حکومت کی حفاظتی دیوار تسلیم کیا (۱۲)۔ یہی وجہ تھی کہ باقی بچ جانے والی ریاستیں برطانوی عہد کے اختتام تک زندہ رہیں اور ان کی حدود بھی وہی رہیں جو ۱۸۵۷ء میں تھیں۔

کشمیر، ۱۹۴۵ تک

جنت نظیر کشمیر، برصغیر پاک و ہند کے شمال مغربی گوشے میں واقع کوہ ہمالیہ کی ایک وادی ہے۔ یہ وادی اپنے قدرتی حسن وخوبصورتی میں بے مثال ہے۔ کشمیر سطح سمندر سے پانچ سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی سطح ہموار اور زمین نہایت زرخیز ہے (۱۳)، یہ وادی اپنی دور افتادگی اور دشوار گزار راستوں کے باعث شمالی ہند پر ہونے والے متعدد حملوں سے محفوظ رہی۔ سکندر یہاں تک نہیں آیا، محمود غزنوی آیا لیکن اس کے حملے کو پسپا کر دیا گیا، چنگیز خان اور تیمور اس کے پاس سے گزر گئے اور مغل بادشاہ بابر نے بھی اس سے تعرض نہ کیا۔ لیکن جب اکبر نے تمام شمالی ہندوستان میں اپنی طاقت کو مستحکم کیا تو کشمیر بآسانی اس کے قبضے میں آ گیا (۱۴)۔ مغلوں کے بعد نادر شاہ نے بھی اس طرف کچھ توجہ نہ کی اور اس طرح یہ غیر منظم ملک احمد شاہ درانی

کے حملوں کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ درانیوں میں پھوٹ پڑی تو سکھوں نے یہاں قبضہ جما لیا، اور کشمیر کو پوری طرح اپنی غلامی میں لے لیا۔ یہ ۱۸۱۹ء کی بات ہے جب رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کر کے اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ سکھوں نے کشمیر پر تقریباً ۳۰ سال حکومت کی اور یہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کا تاریک ترین دور تھا(۱۵)۔ رنجیت سنگھ کے ہی زمانے میں ڈوگرا خاندان کے تین بھائیوں دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ نے بڑا نام پیدا کیا اور رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد کشمیر عملی طور پر ان کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ بھائی سکھ نہ تھے بلکہ سخت متعصب ہندو تھے۔ گویا سکھوں کے بعد ہندو یہاں کے حکمران بن بیٹھے۔ یہ صورتحال تقسیم ہند تک برقرار رہی۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر ہندوستان کی دہشت گردی کا شکار ہوا، پاکستان نے فوری اقدام کے تحت کشمیر کا ایک حصہ آزاد کرا لیا لیکن ایک حصہ آج تک اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا کہ کشمیر اپنی آزادی کی جنگ پچھلی نصف صدی سے لڑ رہا ہے غلط ہوگا۔ کیونکہ تاریخی حیثیت سے ریاست جموں و کشمیر اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے غیروں کی غلامی میں ہے۔ پہلے سکھوں کی، پھر ڈوگروں کی، پھر انگریزوں کی اور اب ہندوستان کی۔ گویا یہ مسلم ریاست دو سو سال سے زائد عرصہ سے غیر مسلموں کی دہشت گردی کا شکار ہے۔

درحقیقت کشمیر پر سیاہ رات کا آغاز اس وقت ہوا جب یہاں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ مغلوں کے بعد ۶۷ سال تک درانی حکومت نہایت نامہربان رہی اور کشمیر کی صورتحال ابتر رہی، سکھوں نے مغلوں کے ہاتھوں جو شکستیں کھائی تھیں اس کا بدلہ انہوں نے بے بس اور مظلوم کشمیری مسلمانوں سے لیا(۱۶)۔ معاشی استحصال عام تھا، مذہبی آزادی نام کو نہ تھی حتیٰ کہ مسلمان با جماعت نماز بھی ادا نہیں کر سکتے تھے(۱۷)۔ یہ ظلم و ستم کی سیاہ رات اس وقت اور بھی تاریک اور طویل ہو گئی جب یہاں ڈوگرا راج قائم ہوا۔ یہ ڈوگرے وادی کشمیر کے آبائی باشندے نہ تھے بلکہ کشمیر سے ملحقہ ایک راجپوت علاقے سے تھے(۱۸) انھیں کشمیر کے مقامی باشندوں اور بطور خاص مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اقتدار کے بھوکے تھے اور ان کی بھوک یہاں مٹ رہی تھی، لہذا انھیں اور کوئی فکر بھی نہ تھی۔ انگریز جو پر امن تاجروں کے روپ میں یہاں آئے تھے، بہت جلد اپنی اصلیت ظاہر کر بیٹھے اور اپنے اصل ناپاک سیاسی عزائم پورے کرنے کے لئے ایک ایک کر کے صوبوں کو شکار کرنا شروع کر دیا۔ جب تمام اہم صوبے اور ریاستیں ہڑپ کر لیں تو پنجاب و کشمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت یہاں گلاب سنگھ ڈوگرا، ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے لاہور، جالندھر، بیاس اور سندھ کا درمیانی پہاڑی علاقہ جس میں کشمیر اور ہزارہ بھی شامل تھے، حاصل کر لیا تو راجہ گلاب سنگھ اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ امرتسر طے پایا۔ جس کی رو سے کشمیر اور ملحقہ علاقے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کی اولاد نرینہ کے حق میں منتقل کر دیے گئے۔ اس کے عوض گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپیہ نانک شاہی (موجودہ ۵۰ لاکھ روپیہ) ادا کرنے کا وعدہ کیا اور یوں کشمیر ہندو راجہ کے ہاتھوں بیچ دیا گیا اور نہایت ارزاں بیچا گیا۔(۱۹)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا کہ گلاب سنگھ نہایت متعصب ہندو تھا، لہذا اب کشمیر کو خرید لینے کے بعد یہاں کے عوام کو زر خرید

غلام کی سی حیثیت دے دی گئی، ظلم وتشدد کی انتہا ہوگئی اور بہت ہی کم عرصے میں یہاں کے مسلمانوں کی حیثیت کم مایہ قلیوں اور مزدوروں کی سی ہوکر رہ گئی۔ ان پر ایسے ایسے ناروا ٹیکس عائد کئے جاتے کہ ان کا تصور بھی محال ہے۔ مثلاً گھر کی کھڑکیوں کی تعداد پر ٹیکس، دھواں نکلنے کی چمنی پر ٹیکس، یہاں تک کہ گھر کے چولھوں پر بھی ٹیکس تھا۔ پھر ان سب پر مستزاد جبری محنت یا بیگار تھی جس کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کو ڈوگرا سپاہیوں کی سنگینوں تلے غلاموں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا(۲۰)۔ اس سیاسی اور معاشی استحصال نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کردی۔ اس پہ طرہ یہ کہ انھیں شکایت کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اگر کوئی مسلمان کسی سیاح کے سامنے حالت زار بیان کرتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا(۲۱)۔ برطانوی حکومت گلاب سنگھ کی وفاداریوں کی وجہ سے چشم پوشی سے کام لیتی رہی کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں گلاب سنگھ کی نے اپنی فوجیں برطانیہ کی حمایت میں بھیجی تھیں۔ لہذا انگریزوں نے کشمیر میں ہونے والے مظالم سے ہمیشہ آنکھیں بند رکھیں۔ (۲۲)

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اہل کشمیر نے ظلم وستم کے اس نظام کے سامنے کبھی ہار نہ مانی۔ وہ مجبور تو تھے لیکن ذہنی طور پر اس ظالمانہ نظام کو کبھی قبول نہ کیا اور آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ ۱۸۴۶ء میں جب معاہدہ امرتسر ہوا تھا، پہلی بغاوت اسی وقت سامنے آئی تھی، جب اس معاہدے کے خلاف میرپور، پونچھ، راجوری اور رانی پور کے غیور مسلمانوں نے آواز بلند کی اور بلتستان اور گلگت کے حریت پسندوں نے اپنی جان پر کھیل کے علم بغاوت بلند کیا۔ بعدازاں وقتاً فوقتاً آزادی کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، جنگ عظیم ادل کے بعد ان صداؤں میں زیادہ تیزی اور تواتر نظر آنے لگا۔ ہندوستان سے کشمیری مسلمان نوجوان تعلیم حاصل کر کے لوٹتے تو اپنے ساتھ آزادی کا جذبہ لے کر آتے۔ چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ انہی نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے کشمیری مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ ۱۹۳۱ء میں پے در پے دو واقعات ایسے ہوئے جو مسلمانوں کی طرف سے بغاوت پر منتج ہوئے، گرچہ ہندو مہاراجہ نے ریاست میں پھوٹنے والی بغاوت کی اس آگ کو بزور دبادیا، ممتاز کشمیری رہنما گرفتار کر لئے گئے (۲۳) لیکن بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب کشمیری مسلمانوں میں اپنے حقوق کے لئے قربانیاں دینے کا داعیہ پیدا ہو چکا تھا، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بغاوت کے ان واقعات کے ایک سال بعد ہی یعنی ۱۹۳۲ء میں ریاست کشمیر میں مسلم کانفرنس قائم ہوئی جو جلد ہی کشمیری عوام کی سب سے اہم آواز بن گئی۔ جس کا واضح ثبوت ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۶ء کے انتخابات ہیں، جن میں مسلم کانفرنس نے اکثریت حاصل کی۔ گوکہ اسمبلی کے پاس اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، تاہم معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کے لئے مسلم کانفرنس اپنا کردار ادا کرتی رہی۔ مسلمانوں کی یہ کامیابیاں ہندو راج کے لئے کسی خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھیں لہذا انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کی کوششیں شروع کردیں اور شیخ محمد عبداللہ اور چودھری غلام عباس جو ایک پلیٹ فارم پر متحد تھے اور کامیابیاں حاصل کررہے تھے، انھیں ایک دوسرے کا حریف اور مدمقابل بنانے میں کامیاب ہوگئے اور شیخ عبداللہ نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے زیر اثر سیکولر خطوط پر نیشنل کانفرنس قائم کرلی۔ آنے والے سالوں میں مسلم کانفرنس نے اپنا سیاسی مستقبل آل انڈیا مسلم لیگ سے اور نیشنل

کانفرنس نے آل انڈیا نیشنل کانگریس سے وابستہ کرلیا۔اس سیاسی اختلاف کے باوجود ان دونوں حضرات نے متوازی طور پر ریاست جموں وکشمیر کی آزادی کے لئے جدو جہد جاری رکھی۔۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کی تو مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے غلام عباس نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا ارادہ کیا۔ چناچہ دونوں رہنما، دیگر ساتھیوں سمیت گرفتار کر لئے گئے۔۱۹۴۷ء میں انتخابات منعقد ہوئے تو مسلم کانفرنس نے ۲۱ نشستوں میں سے ۱۵ پر کامیابی حاصل کرلی باقی چھ نشستوں پر انتخابات منعقد ہی نہ ہوسکے۔مسلم کانفرنس کی مقبولیت کا اندازہ ان انتخابات کے نتائج سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔درحقیقت جب ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی اس وقت سے مسلمانان جموں وکشمیر نے حصول پاکستان کو اپنا مطمع نظر بنالیا تھا اور مسلم کانفرنس نے اسے اپنے سیاسی مقصد کی حیثیت سے اختیار کرلیا تھا(۲۴)۔

یہ ۱۹۴۵ء تک کے کشمیر کی صورتحال تھی، مناسب ہوگا کہ حیدرآباد دکن کا بھی ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ زیر بحث موضوع کا مفہوم زیادہ واضح ہوسکے۔

حیدرآباد دکن، ۱۹۴۵ تک

ہندوستان کے جنوب میں واقع ریاست حیدرآباد دکن علوم وفنون کی آبیاری اور مخصوص ثقافتی رنگ کی وجہ سے ہندوستان کی مختلف ثقافتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ ریاست چودھویں صدی سے مسلمانوں کے تسلط میں رہی تھی، جہاں مسلمانوں نے تقریباً سات سو سال شان وشوکت سے حکومت کی۔حیدرآباد کی منفرد تہذیب اس کی پہچان تھی اور یہ ہر قسم کے بیرونی اثرات سے پاک تھی۔معاشی طور پر ہر دو طبقے یعنی ہندو اور مسلمان بہت مطمئن تھے۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا صرف دس فیصد تھی، اکثریت میں ہندو تھے، یہاں کے حکمران صدیوں سے مسلمان تھے لیکن ہندو طبقہ بہت مطمئن اور خوش تھا، ریاست میں معاشی خوشحالی تھی، بطور خاص ہندو طبقہ معاشی لحاظ سے زیادہ مراعات یافتہ تھا، جس کے لئے یہ طبقہ آج بھی احسان مند ہے۔معیشت کے تمام ذرائع پر ہندو متعین تھے۔زراعت، صنعت وحرفت، تجارت، ساہوکاری سب انہی کے ہاتھوں میں تھی۔مسلمان صرف ملازمت پر قناعت کیا کرتے تھے۔دونوں طبقات میں برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان بھر میں فسادات ہو رہے تھے تو ہندو مسلم فسادات کا کوئی واقعہ حیدرآباد میں رونما نہ ہوا(۲۵)۔

حیدرآباد کا زوال عملاً ایک تہذیب اور ایک زبان کا زوال تھا، جس کی ابتدا ۱۸۰۰ء میں اس وقت ہوئی جب نظام دکن نے انگریزوں سے عہد معاونت کا معاہدہ کرلیا جسے Subsidiary Alliance کہا گیا(۲۶) یہ معاہدہ نظام علی خان آصف جاہ دوم کے زمانہ اقتدار میں ہوا، اس وقت دکن میں چار طاقتیں برسر پیکار تھیں: نظام، مرہٹے، میسور کے حکمران اور انگریز۔ مرہٹے مسلم حکومت کے خلاف تھے، جبکہ انگریز مرہٹوں اور مسلمانوں دونوں کے خلاف تھے۔اسی طرح مسلم ریاستوں (نظام اور ٹیپو) کے مشترکہ دشمن مرہٹے اور انگریز تھے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ کسی مقابلے کی صورت میں مسلم ریاستیں اتحاد قائم کرلیتیں

مگر ایسا نہ ہوسکا۔نظام اور حاکمِ میسور کی دیرینہ ناراضگی (۲۷) نے انھیں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں متحد نہ ہونے دیا۔دوسری طرف دکن میں موجود انگریزوں کی مکارانہ چالیں، نظام اور ٹیپو میں تعلقات استوار ہونے ہی نہ دیتی تھیں (۲۸)۔نتیجہ یہ نکلا کہ جب میسور پر حملہ ہوا تو نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ٹیپو سلطان یکاوتنہا مجاہد کی طرح لڑتا ہوا شہید ہوا۔اس وفاداری کا صلہ نظام کو دوچھوٹے سے علاقے کڑپہ اور بلاری عطا کر کے ادا کر دیا گیا (۲۹)۔لیکن یہ صرف اشک شوئی کے لئے تھا، بہت جلد انگریزوں نے یہ دونوں علاقے واپس لینے کے لئے چالیں چلنا شروع کیں اور ۱۸۰۰ء میں عہد معاونت کا معاہدہ کرلیا۔جس کی رو سے طے پایا کہ اگر دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک پر کوئی تیسری طاقت حملہ کرتی ہے تو دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے، انگریز نظام کے علاقوں کی حفاظت کریں گے جس کے لئے مزید فوج رکھی جائے گی، لہذا اس کے اخراجات اٹھانے کے لئے کڑپہ اور بلاری کے علاقے انگریزوں کو دے دئے جائیں۔نیز اس معاہدے کے تحت یہ بھی طے پایا کہ کمپنی کی رضا مندی کے بغیر نظام کسی اور طاقت سے نہ تو تعلقات استوار کر سکتے ہیں اور نہ ہی کمپنی کے فیصلوں سے انحراف کر سکتے ہیں۔یہ تھا وہ عہد معاونت کا معاہدہ جس نے حیدرآباد کو اس کی خارجی آزادی سے محروم کر دیا (۳۰)۔

ساحلی اور غیر ساحلی علاقوں کے ایک بڑے حصے کو مختلف معاہدات کے تحت انگریزوں کے حوالے کر دینے کے بعد ریاست حیدرآباد صرف (۸۲۶۹۸) مربع میل پر محیط رہ گئی (۳۱)۔اب بھی اس کا رقبہ فرانس اور برطانیہ سے کم نہ تھا، مگر افسوس کہ اب اس کے پاس سمندر نہیں رہا تھا۔مچھلی پٹم اور نظام پٹم جیسے سمندری راستے والے علاقوں سے حیدرآباد کو پہلے ہی محروم کیا جا چکا تھا اور اب وہ نہ صرف خارجی طور پر برطانوی ہند کے حصار میں آچکی تھی بلکہ داخلی طور پر بھی انگریزوں نے اپنے قدم مضبوط کر لئے تھے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان سب کے باوجود انگریزوں نے حکمران دکن کو چلنے کی آزادی دے رکھی تھی اور ایسا صرف اس لئے تھا کہ دکن حکمرانوں نے ہمیشہ تاج برطانیہ سے حلیفانہ تعلقات رکھے اور تاریخ میں ایسے کئی واقعات رقم ہیں جو کہ تاج برطانیہ سے وفاداری کی مثالیں ہیں۔مثلاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران نظام دکن انگریزوں کی وفاداری پر قائم رہے، درآں حالیکہ یہ ہندوستان کی تاریخ کا بڑا نازک دور تھا، اور انگریز اس صورتحال سے خوفزدہ بھی تھے کہ اگر حیدرآباد نے بغاوت کر دی تو پورا صوبہ بمبئی اور سارا جنوبی ہند اس کی پیروی کرے گا اور حالات انگریزوں کے قابو سے باہر ہوجائیں گے۔مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔حیدرآباد انگریزوں کی حمایت پر قائم رہا۔بالکل اسی طرح جس طرح کشمیر کے مہاراجہ نے انگریزوں کی وفاداری نبھائی اور نتیجتاً کشمیر سے نوازے گئے لیکن حیدرآباد دکن کے نظام کو ان کی وفاداری کا صلہ عثمان آباد اور رائچور دوآب جیسے چھوٹے اضلاع کی صورت میں ملا (۳۲)۔جنگ آزادی ناکامی کے باوجود بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اس بغاوت نے ثابت کر دیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت ہندوستان پر کمزور ہے۔چناچہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۸۵۸ء کے تحت کمپنی کا خاتمہ کر دیا گیا۔اور ہندوستان براہ راست ملکہ برطانیہ کی عملداری میں شامل کرلیا گیا۔برطانوی پارلیمنٹ میں ''وزیر ہند'' کا تقرر عمل میں آیا، سرکاری مجلس نظارت کی جگہ ''مجلس ہند'' (انڈیا کونسل) قائم ہوئی، یہ

پندرہ اراکین پر مشتمل تھی، تاکہ وزیر ہند کو ملکی امور میں مشورے دے سکے (۳۳)۔ پھر اس بغاوت کے بعد ظلم وستم کا ایک نیا سلسلہ چلا جس کا براہ راست شکار مسلمان تھے، ہندوؤں کیخلاف انگریزوں کا ردعمل اتنا شدید نہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میر عثمان علی خان کو اقتدار سنبھالے تین سال کا مختصر عرصہ ہوا تھا۔ میر عثمان علی خان اپنے اسلاف کی روش پر قائم رہے اور ایسے نازک وقت میں بھی اتحادیوں کو جنگ میں اور جنگی مقاصد حاصل کرنے میں بھرپور مدد کی اور تقریباً ۶۲ (باسٹھ) کروڑ سے زائد کی مالی اور فوجی امداد دی، جس کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۸ء میں نظام دکن کو ''یار وفادار برطانیہ'' (Faithfull Ally of Birthish Govt) اور (His Exalted Highness) کے القابات سے نوازنے کے سوا کچھ نہ دیا (۳۴)۔ دوسری جنگ عظیم میں اس سے بھی بڑھ کر تعاون کیا گیا۔ ایک بڑی فوج دی گئی جس کے خوب چرچے ہوئے۔ غرض سوا دو سو سال کے عرصے میں سلطنت آصفیہ کے تاجداروں نے انگریزوں کے ساتھ جس فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، ہندوستان کی کسی دیسی ریاست نے نہ کیا تھا۔ اس سب کے باوجود مسلمان اس طرح کبھی بھی نہیں نوازے گئے جس طرح ہندو فیض یاب ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے سامنے انگریزوں کے چہرے کی نقاب سرکتی ہی نہ تھی اور وہ، بطور خاص نظام دکن ہمیشہ اسی خوش فہمی میں رہے کہ انگریزوں کی حمایت ان کو حاصل ہے۔

ریاستوں کی صورتحال، بعد از ۱۹۴۵ء

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے کا اصولی فیصلہ کرلیا۔ ریاستوں کا مسئلہ تصفیہ طلب تھا اور اس سے صرف نظر ممکن نہ تھا کیونکہ ایک تو یہ بہت بڑی تعداد میں تھیں، دوسرے ہندوستان کے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ چناچہ ۱۹۳۰ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ کی سفارش پر ایک مشاورتی جماعت ''ایوان والیان ریاست'' کے نام سے عمل میں لائی گئی (۳۵)۔ لیکن اس میں بعض بڑی ریاستوں اور حیدرآباد دکن نے شرکت ضروری خیال نہ کی، بطور خاص نظام دکن نے، کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کے علاوہ داخلی اور خارجی طور پر آزاد وخود مختار ہیں، اور انگلستان میں جو حیثیت بادشاہ کی ہے وہی حیثیت حیدرآباد میں نظام کی ہے۔ اس موقف پر حیدرآباد آخر تک قائم رہا مگر حکومت برطانیہ کا موقف کبھی بھی یہ نہ رہا (۳۶)۔ حیدرآباد پر حکومت برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کا سب سے پہلا اعلان ۱۹۲۵ء میں کیا گیا۔ لارڈ لیڈنگ نے ایک مراسلے میں نظام دکن پر واضح کیا کہ برطانوی بالادستی ہندوستان میں سب پر مقدم ہے Birtish Paramountcy اور اس پر کسی کو بھی برتری نہیں، نیز ریاستوں کے اندرونی معاملات میں حکومتِ برطانیہ کو حقِ مداخلت حاصل ہے۔ اب انگریز کھل کر سامنے آگئے اور دوستی کا وہ لبادہ جو انہوں نے اوڑھ رکھا تھا، اس کے پیچھے سے ان کا مکروہ چہرہ جھلکنے لگا۔ ظاہر ہے کہ نظام حیدرآباد نے برطانوی اقتدار کی یہ شکل کبھی بھی دل سے قبول نہ کی، وہاں کے مسلمانوں کی مقبول ترین جماعت ''مجلس اتحاد مسلمین'' (۳۷) کے اغراض ومقاصد میں بھی اس تصور کی مخالفت ہمیشہ شامل رہی۔ (۳۸)

ایک طرف کانگریس مسلسل اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا تھی اور اپنے آپ کو برطانوی اقتدار کا واحد جانشین سمجھ رہی تھی،

اسی زعم میں کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ہندوستان کی ریاستوں کو ہند کا جزو لانیفک قرار دیا گیا(۳۹)، تو دوسری طرف والیان ریاست کا یہ مطالبہ تھا کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے ان کی منظوری کے بغیر کوئی ایسی یقین دہانی نہ کرائی جائے جس سے ریاست کے حقوق متاثر ہوتے ہوں، نیز اگر ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے تو تیسرا حصہ ہندوستانی ریاستوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔اور بالادستی کسی بھی طور حکومت ہند کو منتقل نہ کی جائے (۴۰)۔لیکن یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے آزادی ہند کا قانون منظور کر لیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۷ء میں ضروری ترامیم کے ساتھ اسے انڈیا آڈر ۱۹۴۷ء کے نام سے نافذ کر دیا اور ''پیرامونٹیسی'' کے خاتمے کا بھی اعلان کر دیا۔کابینہ مشن نے روسائے ہند کو اطلاع دی کہ ''جب برطانوی حکومت رخصت ہوگی تو پیرامونٹیسی جانشین حکومت یا حکومتوں کو منتقل نہیں کی جائے گی بلکہ ریاستیں اسی حالت پر عود کر آئیں گی جو معاہدات سے قبل انھیں حاصل تھی۔''(۴۱) لیکن تاج برطانیہ نے اپنے بیان کا خود لحاظ نہ کیا اور جب اپنا اقتدار منتقل کر کے جانے لگا تو دیسی ریاستوں کے حقوق کا استرداد کئے بغیر صرف ہندوستان سے معاملات کر کے چلا گیا اور دیسی ریاستوں کو ہندوستان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ برطانیہ کا اقدام کس حد تک انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ معاہدات ختم کئے جاتے اور ان کے تحت حاصل کردہ علاقے بھی واپس کئے جاتے۔انگریزوں کی اس وعدہ خلافی کی وجہ سے وہ علاقے جو ریاستوں کو واپس لوٹائے جانے چاہئے تھے، نہیں لوٹائے گئے اور نہ ہی ریاستیں اپنی پرانی صورتحال پر واپس آسکیں۔

حکومت برطانیہ نے قانون آزادی ہند کی دفعہ ۷ کے تحت یہ بھی اعلان کیا تھا کہ ریاستوں کے حکمران پاکستان یا ہندوستان جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتے ہیں۔تاہم یہ فیصلہ کرتے وقت انھیں عوام کی خواہشات اور ریاست کے جغرافیائی صورتحال کو مدنظر رکھنا ہوگا۔وائسرائے ہند لارڈ ماونٹ بیٹن نے اس کی وضاحت میں کہا۔

''عمومی طور پر جغرافیائی محل وقوع، آبادی کے مذہبی رجحانات اور مفادات وغیرہ وہ عناصر ہونگے، جن پر توجہ دی جائے گی۔''(۴۲)

لیکن وقت نے ثابت کیا کہ قانون آزادی ہند اور وائسرائے ہند کے دعوے کاغذی تھے، صورتحال تیزی سے بدل رہی تھی، چھوٹی ریاستیں پہلے ہی اپنے قدموں پر کھڑی رہنے کے قابل نہ تھیں اور الحاق ہی ان کا واحد ذریعہ نجات تھا، چنانچہ الحاق کے نام پر ان کو حکومت ہند میں ضم کر دیا گیا۔ بڑی ریاستوں کا الحاق البتہ دشوار ثابت ہو رہا تھا لہذا ان کے الحاق کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔نتیجہ یہ نکلا کہ ابتداً مہاراجہ پٹیالہ، گوالیار، بڑودہ اور بیکانیر حکومت ہند کے ساتھ شرکت پر آمادہ ہوگئیں، بعد ازاں دیگر ریاستیں بھی ہندوستان سے شرکت پر راضی ہوتی چلی گئیں۔جونا گڑھ پاکستان سے الحاق چاہتا تھا، اس پر جبر سے قابو پا لیا گیا۔اب صرف حیدرآباد اور کشمیر دو ہی ایسی ریاستیں رہ گئیں تھیں جو اپنی آزادی برقرار رکھے ہوئے تھیں (۴۳)، بوقت تقسیم نظام دکن کا موقف تھا کہ ہندوستان میں شمولیت ریاست کے مسلمانوں کے لئے اور پاکستان میں شمولیت ریاست کے ہندوؤں کے لئے دل آزاری کا باعث ہوگی لہذا حیدرآباد اپنی حیثیت میں آزاد رہنے کا اعلان کرتا

ہے، نیز یہ کہ حیدرآباد ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے گا(۴۴)۔اس کے برعکس کشمیر کے عوام پاکستان سے الحاق کے حق میں تھے،ان کے جذبات کی ترجمانی اس وقت کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو پاکستان سے الحاق کی قرارداد منظور کر کے ادا کر دی تھی۔ یہ قرارداد ان الفاظ میں منظور کی گئی۔

''مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی ۸۰ فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے دو اہم دریاؤں کے ریاست سے نکلنے،لسانی، ثقافتی،نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے اشتراک یہ سب حقائق اس امر کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر، پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔''(۴۵)

یہی وجہ تھی کہ جب ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر پر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ریاست کے ہر حصے کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کا جشن منایا، پاکستان کا پرچم لہرایا گیا، اسے سلامی دی گئی اور ریاست کشمیر کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پاکستان سے الحاق کے حق میں جلسے جلوس منعقد ہوئے۔ یہ صورتحال کشمیر کے مہاراجہ کے لئے ناقابل قبول تھی لہذا اس نے دوہرا کھیل کھیلنے کی کوشش کی، ایک طرف وہ ہندوستان کی قیادت اور انگریزوں سے ساز باز کرتا رہا، دوسری طرف پاکستان کو دھوکہ دینے اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانے میں مصروف رہا۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے سیدھے الحاق کے بجائے پاکستان سے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو Stand-still Agreement کیا(۴۶)،جس کی رو سے پاکستان عارضی طور پر ان امور کا نگران ہو گیا جو برطانوی حکومت انجام دے رہی تھی۔ پاکستان اس دھوکے میں رہا کہ یہ مکمل الحاق کی طرف پہلا قدم ہے، جبکہ مہاراجہ کسی اور ہی سازش میں مصروف تھا۔اس سے قبل جولائی ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ نے تمام مسلمان رعایا کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے تمام ہتھیار حکومت کے حوالے کر دیں۔فوج اور پولیس میں جتنے بھی مسلمان تھے ان کو اسی سال اگست تک غیر مسلح کر دیا گیا۔دوسری طرف ہندوستان کی انتہا پسند مسلم دشمن قوتوں سے رابطہ قائم کیا گیا،جن میں راشٹریہ سیوک سنگھ (R.S.S)اور ہندو مہاسبھا قابل ذکر ہیں۔ان تنظیموں نے ریاستی پولیس اور فوج کے تعاون سے مسلمانوں پر منظم حملے شروع کئے۔ ویسے تو یہ خوفناک سرگرمیاں پوری ریاست میں شروع کی گئی تھیں لیکن پونچھ، میرپور اور صوبہ جموں ان کا خصوصی مرکز تھے، جہاں ڈوگرا فوج، پولیس، آر، ایس، ایس، ہندو مہاسبھا اور مقامی ہندوؤں نے مل کر ستمبر ۱۹۴۷ء کو بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا، ہزاروں مسلمان شہید کر دئے گئے۔مسلمان خواتین کو بے آبرو کیا گیا(۴۷)۔کشمیر کے معاملے میں مہاراجہ، ہندوستان اور برطانوی سیاست دانوں کی نیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریڈ کلف باﺅنڈری کمیشن نے ایک سازش کے تحت ضلع گورداسپور کا مسلم اکثریتی علاقہ ہندوستان کے سپرد کر دیا تھا جو ہندوستان کو ریاست جموں وکشمیر سے ملاتا تھا اور اس طرح ہندوستان کے لئے کشمیر میں گھسنے کا راستہ کھول دیا گیا(۴۸)۔ ریاست میں جس تیزی سے اور جس منظم انداز میں مسلمانوں کو ختم کیا جا رہا تھا، اس نے مسلمانوں میں غم وغصے کو ہوا دی اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پونچھ کے غیور مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور آزادی کے لئے باقاعدہ ہتھیار سنبھال لئے۔ یہاں کے حالات کی خبریں پاکستان پہنچیں تو

سرحدی قبائل کے لوگ، کشمیریوں کی مدد کے لئے پہنچنا شروع ہو گئے اور ان سب کی مشترکہ جدوجہد سے کشمیر کا ایک حصہ مہاراجہ کے چنگل سے آزاد کرالیا گیا اور مسلم کانفرنس کی زیر نگرانی ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد جموں وکشمیر حکومت قائم کر دی گئی اور سردار محمد ابراہیم اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے (۴۹)۔ جو علاقہ آزاد ہونے میں کامیاب رہا وہ ۳۲ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ہے، اور جو آج آزاد کشمیر، گلگت و بلتستان کہلاتا ہے، یہ مہاراجہ کی ایک بڑی شکست تھی لہذا اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا اور وہ بھارت سے مدد مانگنے پہنچ گیا۔ بھارت نے فوجی امداد دینے سے قبل اسے ایک معاہدہ الحاق کے لئے مجبور کیا جس کی رو سے مہاراجہ کو یہ اعلان کرنا تھا کہ کشمیر بھارت کا حصہ بن گیا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ مہاراجہ نے الحاق کے اس معاہدے پر ۲۶/اکتوبر کو دستخط کر دیئے اور بھارتی فوجیں کشمیر میں اتر گئیں، فوجیں تو یقیناً اتریں لیکن ایسٹر لیمب کی تحقیق کے مطابق مہاراجہ نے الحاق کی کسی دستاویز پر دستخط نہیں کئے تھے، لہذا یہ الحاق مکمل طور پر فراڈ اور دھوکہ دہی پر مبنی ہے (۵۰)۔ بہرحال اگلے ہی روز یعنی ۲۷/اکتوبر کو ۹ بجے صبح بھارتی فوج ہوائی جہازوں کے ذریعہ سری نگر میں اتر گئی اور مجاہدین آزادی کے خلاف جنگ شروع ہوگئی۔ یہ پاکستان کے ساتھ کئے گئے معاہدہ جاریہ کے خلاف تھا چنانچہ قائداعظم نے اپنی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے کا حکم دیا لیکن پاکستانی افواج کے انگریز سربراہ جنرل گلیسنی نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ اگر اس وقت پاکستانی فوجیں اسی طرح زبردستی کشمیر پر قبضہ کر لیتیں جس طرح ہندوستان نے جونا گڑھ پر کیا تھا تو آج کشمیر پاکستان کا ایک صوبہ ہوتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے گورداسپور، جونا گڑھ اور حیدرآباد اور کئی علاقے آج بھارت کا حصہ ہیں، جبر و طاقت استعمال کرتے ہوئے بھارت نے جو کچھ لینا تھا، لے لیا بلکہ سب کچھ ہی لے لیا سوائے کشمیر کے، کہ وہ اس کے قابو نہ آیا۔ اس کے برعکس پاکستان اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے بحث و استدلال، بین الاقوامی سالمیت اور اقوام متحدہ پر بھروسہ کرتا رہا تو سوائے ناکامیوں کے اسے کیا حاصل ہوا۔

پاکستان کے ردعمل سے بچنے کے لئے لارڈ مانٹ بیٹن نے، جو اس زمانے میں بھارت کا گورنر جنرل تھا، اپنے ایک خط میں مہاراجہ کشمیر کو لکھا کہ ''میری حکومت کی خواہش ہے کہ جب کشمیر میں امن و امان بحال ہو جائے اور ریاست حملہ آوروں سے خالی ہو جائے، تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ وہاں کے عوام کی رائے کے مطابق حل کیا جائے۔'' (۵۱)

وہ بھارتی گورنر جنرل تھے لہذا ان کی آواز کو بھارت ہی کی آواز سمجھا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دوسرے ہی دن نہرو نے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ایک تار ارسال کیا جس میں یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ ''ہماری یہ یقین دہانی ہے کہ جیسے ہی امن و امان قائم ہوگا ہم کشمیر سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے اور کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کی خواہشات اور ان کی رائے کے مطابق ہوگا۔ یہ صرف آپ کی حکومت کے ساتھ ایک عہد نہیں ہے بلکہ کشمیر کے عوام اور پوری دنیا کے ساتھ ایک وعدہ ہے۔'' (۵۲)

لیکن یہ عہد آج تک پورا نہ ہوا۔ نہ ہی بھارتی فوجیں واپس گئیں اور نہ ہی کوئی ایسا فیصلہ سامنے آیا جس میں کشمیر کے عوام

کی خواہشات اور رائے کو سامنے رکھا گیا ہو۔ زور زبردستی، جبر اور تشدد کی ایک طویل داستان جس کا کوئی حل کسی کے پاس نہیں۔

دوسری طرف بھارت مسلسل حیدر آباد پر بھی عرصہ حیات تنگ کر رہا تھا، حیدر آباد کے سلسلے میں سارے دلائل (سوائے ایک دلیل کے) بھارت کے حق میں تھے۔ یعنی اس کی سرحدیں چاروں طرف سے ہند سے ملتی تھیں، عوام کی اکثریت ہندو تھی، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا کہ یہ ہندو عوام آزاد حیثیت میں زندہ رہنا چاہتے تھے، قانون آزادی ہند انھیں یہ حق دیتا بھی تھا لیکن بھارت ریاستی دہشت گردی میں سرتا پا ڈوبا ہوا تھا۔ پہلے سرد جنگ اور معاشی ناکہ بندی کے ذریعہ اسے حکومت ہند میں شمولیت اختیار کرنے پر مجبور کیا جانے لگا (۵۳)۔ پھر سرحدوں پر گھیرا تنگ کیا جانے لگا۔ حالانکہ اس وقت بھارتی حکومت سخت پریشانی میں مبتلا تھی۔ جونا گڑھ کے مسئلہ کی وجہ سے اسے اندیشہ تھا کہ پاکستان سے حملہ نہ ہو جائے (۵۴)۔ کشمیر کے ایک حصے پر آزاد حکومت قائم ہو چکی تھی، بقیہ حصہ حاصل کرنے کے لئے بھارتی فوجیں جموں و کشمیر میں اتر چکی تھیں اور وہاں سخت کشیدگی تھی۔ لہذا ہندوستان نے حیدرآباد کو Stand-still agreement کی پیش کش کی۔ یہ موقع اچھا تھا کہ نظام دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات منوا لیتے لیکن وہ اس معاہدے پر ہی اکتفا کر گئے، یہ معاہدہ حکومت ہند کے لئے اس لئے مناسب تھا کہ وہ ابھی کشمیر اور پاکستان کے سامنے حیدرآباد سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو طے پانے والے اس معاہدے میں حکومت ہند کو پابند کیا گیا کہ وہ کسی صورت میں بھی پیرامونٹیسی کے اختیارات استعمال نہیں کرے گی اور نزاع کی صورت میں معاملہ ثالثی کے سپرد ہوگا۔ اس معاہدے کے بعد نظام دکن کو یہ اطمینان تھا کہ اب حکومت ہند حیدرآباد پر براہ راست حملہ نہیں کر سکتی، یہ ادراک حکومت ہند کو بھی تھا (۵۵)۔ چنانچہ حیدرآباد کو زیر کرنے کے لئے سرحدی شورشیں، معاشی ناکہ بندی، مبالغہ آمیز پروپیگنڈا اور مقامی ہندوؤں کو حکومت دکن کے خلاف اکسانا شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ ہر صبح حیدرآباد کے مسلم عوام پر ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے مظالم سے شروع ہوتی، یہ مقامی ہندو نہ تھے بلکہ ان ہندوؤں کو مدراس اور دہلی سے باقاعدہ تربیت کے بعد مسلح کر کے بھیجا جا رہا تھا۔ کانگریس کے ایک لیڈر رام چندراؤ نے اس موقع کی تفصیلات دیں کہ پہلے مرحلے میں نو ہزار مسلح دہشت گرد حیدرآباد بھیجے گئے۔ دوسرے مرحلے میں تقریباً سات سو سرحدی چوکیوں کو تباہ کیا گیا اور تیسرے مرحلے میں رسائل حمل و نقل کو نقصان پہنچایا گیا۔ حیدرآباد کی ہوائی سروس دکن ائیرویز کے نام سے چلائی جاتی تھی۔ جو دہلی سے بمبئی، مدراس اور بنگلور جاتی تھی۔ اس ائیرویز کی پرواز کا لائسنس حکومت ہند نے جولائی میں منسوخ کر دیا اور ہوائی راستہ بند کر دیا گیا۔ کچھ دونوں کے بعد گرانڈ ٹرنک ایکسپریس ریل جو مدراس سے براستہ حیدرآباد، دہلی تک جاتی تھی، اس کا رخ موڑ دیا گیا اور حیدرآباد سے باہر باہر کر دیا گیا، تار اور ٹیلی گرام بھی وصول نہیں کئے جاتے تھے، فون سے گفتگو مشکل تھی کیونکہ یہ ریکارڈ کی جاتی تھی، اس طرح سے حیدرآباد کو باہر کی دنیا سے بالکل کاٹ دیا گیا۔ پٹرول کی فراہمی بند کر دی گئی، کلورین اور ادویات کی ترسیل روک دی گئی، روزمرہ کی ضروریات زندگی، اشیاء خوردنی اور کپڑے وغیرہ کی فراہمی بھی روک دی گئی تاکہ عوام میں ہراس پیدا ہو۔ لیکن

یہاں کے عوام نے ہمت نہ ہاری اور آزادی برقرار رکھنے کے لئے یہ جنگ سیاسی، سرکاری، معاشی اور عوامی ہر سطح پر لڑی گئی۔ معاشی ناکہ بندی کے زمانے میں پٹرول کی جگہ پاور الکوحل استعمال کر کے موٹریں چلائی گئیں، ڈیزل آئل کی جگہ ارنڈی اور مونگ پھلی کے تیل کا آمیزہ بنا کر بسوں کو چلایا گیا، کلورین اور ادویات وہیں بنائی جانے لگیں، انگریزی ادویات کی جگہ دیسی علاج فروغ پا گیا، ذرائع آمد و رفت کم ہونے کی وجہ سے وزراء تک سائیکلوں پر سفر کرنے لگے۔ جان و مال کے نقصان کو اہل ملک کے لئے قربانی تصور کیا جانے لگا، یہ قابل رشک جذبہ آزادی کی ناپید مثالیں ہیں (۵۶)۔

میر لائق علی (۵۷) نے ریاست کو خطرے میں گھرا دیکھ کر ۱۷/اگست ۱۹۴۷ کو حکومت ہند کے نام ایک مکتوب تحریر کیا کہ معاہدہ انتظام جاریہ کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ریاست تحفظات کا شکار ہے، لہذا وہ اس مسئلہ کو سیکیورٹی کونسل میں لے جانا چاہتا ہے، تاکہ باہم تنازعات طے پا سکیں، ہندوستان نے اس پر شدید احتجاج کیا کہ حیدرآباد کا مسئلہ ہندوستان کا اندرونی معاملہ ہے اس لئے اقوام متحدہ اس پر غور کرنے کی مجاز نہیں۔ حکومت ہند نے اس وفد کو اقوام متحدہ جانے کے لئے سہولتیں دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کے باوجود حیدرآبادی وفد اگست کے آخر میں کراچی روانہ ہوا اور وہاں سے نواب معین نواز جنگ کی قیادت میں نیویارک روانہ ہو گیا (۵۸)۔ اس وفد کو اپنا مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں پیش کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ وفد کے پاس وقت کم تھا، وہ اپنا مقدمہ جلد سے جلد پیش کرنا چاہتا تھا اور جلد سے جلد کوئی فیصلہ چاہتا تھا تاکہ ہندوستان کے عزائم کے آگے بند باندھا جا سکے۔ لیکن سیکیورٹی کونسل کے پاس وقت نہ تھا۔ دوسری طرف حکومت ہند نے اس وفد کی روانگی کے ساتھ ہی حیدرآباد پر حملہ کرنے کے انتظامات تیز تر کر دیئے، اس کی خواہش تھی کہ یہ مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں پیش ہونے سے پہلے ہی حیدرآباد پر قبضہ کر لیا جائے۔ بعد از خرابیٔ بسیار سیکیورٹی کونسل سے حیدرآبادی وفد کی ملاقات کے لئے ۱۶/ستمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر ہوئی (۵۹)۔ حیدرآباد کو پاکستان سے بڑی توقعات تھیں کہ وہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں حیدرآباد کی مدد کرے گا لیکن المیہ یہ ہوا کہ ۱۱/ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کا انتقال ہو گیا، ایسے وقت میں جب کہ پوری پاکستانی قوم اپنے قائد کے چلے جانے پر شدید دکھ میں مبتلا تھی اور ان کی آخری رسومات میں مصروف تھی، حکومت ہند کے لئے اس سے زیادہ سنہری موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا ادراک میر لائق علی کو بھی تھا لہذا جب رات کے آخری حصے میں پولیس چیف نے قائداعظم کے انتقال کی اطلاع میر لائق علی کو دی تو وہ سکتے میں آ گئے۔ یہی ہوا اور ۱۳/ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد پر ۲۲ محاذوں سے بیک وقت حملہ کر دیا گیا۔ شولاپور اور وجے باڑہ کی طرف سے حملہ سب سے زیادہ شدید تھا جس میں ۲۵ ہزار فوج کو ۷۰ شرمن ٹینک کی مدد حاصل تھی، دیگر حملے جو مختلف محاذوں پر کئے گئے وہ البتہ اتنے شدید نہ تھے۔ ہندوستانی فوج کو کئی مقامات پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ جبکہ کچھ مقامات پر صورتحال یکسر مختلف تھی اور ہندوستانی فوج دندناتی ہوئی اندر تک گھسی آ رہی تھی۔ اس وقت میر لائق علی کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا جو انہوں نے ایک نااہل اور سازشی کمانڈر العیدروس پر اعتماد کر کے کی تھی اس کا اعتراف انہوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے (۶۰)۔ اس موقع پر رضا کاروں کے ایثار اور قربانیوں کا

تذکرہ نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ یہ نوجوان رضا کار ہندوستانی حملہ پر سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئے تھے۔ انھیں لاریوں میں بھر بھر کر محاذ جنگ پر بھیجا جانے لگا۔ان کے پاس نہایت ہلکے ہتھیار مگر جوشِ جہاد تھا۔ جب ریاست کی فوج العیدروس کے حکم سے پیچھے ہٹ رہی تھی تو یہ رضا کار آگے بڑھتے ہوئے برچھوں اور بھالوں سے دبابوں (بکتر بند) کی چین گرار ہے تھے اور اس کے سامنے لیٹ جاتے تھے،تقریباً تیس (۳۰) ہزار رضا کاروں نے اپنے وطن پر جان دی (۶۱)۔

چہار جانب سے داخل ہونے والی ہندوستانی فوج بغیر کسی فوجی مزاحمت کے، یک طرفہ مارچ کرتی ہوئی بڑھتی رہی، کمانڈر العیدروس اپنا بیلٹ تنگ کرنے کے بہانے اپنی فوج کو پیچھے ہٹاتے رہے۔مزاحمت کا سامنا ہوا تو صرف حیدرآبادی رضا کاروں کی طرف سے جو ایک اسلحہ سے لیس بڑی فوج کو روکنے کے لیے ناکافی تھے،لہذا ۱۷ ستمبر کو بعد دوپہر ہندوستانی فوج حیدرآباد کے فوجی ہیڈ کوارٹر سکندرآباد تک پہنچ گئی (۶۲)۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بیگم پیٹ ہوائی اڈے پر ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی جس میں ہندوستانی فوج کے سربراہ جنرل چودھری اور حیدرآبادی فوج کے کمانڈر ان چیف ولی عہد شہزادہ اعظم جاہ نے ریاست کی جانب سے ''قبولی شکست'' کے مقررہ دستاویز پر دستخط کر دیئے۔جس کے فوری بعد نہ صرف والی حیدرآباد میر عثمان علی خان، نظام حیدرآباد کی بادشاہت ختم ہوئی، بلکہ دوسو چوبیس (۲۲۴) سالہ سلطنت آصفیہ، ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ جنرل چودھری نے نظام کی جانب سے پیش کردہ نئی کابینہ کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے مارشل لا کا اعلان کر دیا اور حیدرآباد کو عملاً اپنے قبضے میں لے لیا (۶۳)۔اس طرح حیدرآباد صرف پانچ دن کی فوجی کاروائی میں ہندوستان کے حوالے ہوگیا۔

حیدرآباد میں اتنی ''شاندار'' کامیابی کے بعد بھارت کے حوصلے نہایت بلند تھے۔ جوناگڑھ، گورداسپور جیسے علاقے بھی اس کی دہشت گردی کا شکار تھے۔بس ایک کشمیر تھا جو اس کی مرضی اور منشا کے مطابق اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا حالانکہ وہ کشمیر کے بڑے علاقے پر اپنی فوجیں روانہ کر چکا تھا، پھر بھی پورے کشمیر کی لالچ میں اس کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ صورتحال یہ تھی کہ پاکستانی فوجیں تو انگریز جنرل کی مبینہ حکم عدولی کے تحت کشمیر میں داخل نہ ہوسکیں لیکن آزاد کشمیر کی فوجوں نے ہندوستانی فوجوں کے لئے مشکلات کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ اپنی فوج کو شکست خوردہ دیکھ کر بھارت نے یکم جنوری ۱۹۴۸ کو مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا اور پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ قبائلی حملہ آوروں کی مدد کر رہا ہے۔ پاکستان نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو بھارت کے الزامات کا جواب اور ایک جوابی شکایت سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی اور یہ تجویز سامنے رکھی کہ غیر ریاستی لوگوں کو واپس بلا کر ریاست کے مہاجرین کو وہاں دوبارہ آباد کیا جائے۔اور غیر جانبدار اور نمائندہ حکومت قائم کر کے اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے۔انجام کار ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد پاس کر لی اور پانچ ارکان پر مشتمل ''کمیشن اقوام متحدہ برائے ہندو پاک'' متعین کیا جسے ریاست میں استصواب رائے کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی، یہ کمیشن اگست میں برصغیر آیا اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی عمل میں آگئی (۶۴)۔

اس کمیشن نے دو قراردادیں پاس کی تھیں، ایک ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو جس میں جنگ بندی اور فوجوں کے انخلا کی

تفصیلات تھیں اور استصواب ہی کو مسئلہ کشمیر کا واحد حل قرار دیا گیا تھا، دوسری قرارداد جو ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور ہوئی اس میں ناظم رائے شماری کے تقرر کے متعلق تفصیلات تھیں۔ یہ دونوں قراردادیں نہ صرف کشمیر پر عالمی معاہدے کی بنیاد تھیں بلکہ اس سے کشمیر کے مسئلہ کے منصفانہ حل کی راہ ہموار ہوتی تھی (۶۵)۔ پاکستان مسلسل زور دیتا رہا کہ اس مسئلہ کو انہی قرار دادوں کے مطابق حل کیا جائے مگر بھارت اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلسل اس مسئلہ کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ٹالنے میں کامیاب رہا ہے۔ بھارت کی حکمت عملی میں واضح طور پر تضاد رہا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل کرنا ضروری خیال نہیں کرتا۔ اقوام متحدہ ہو یا سلامتی کونسل کا اجلاس یا پاک بھارت مذاکرات، دستاویزات پر بھارت کے دستخط ہونے کے باوجود اس کا ہر عمل ان دستاویزات کی نفی کرتا ہے۔ اس کا کھلا مظاہرہ یہی تھا کہ پاکستان کے بھرپور احتجاج کے باوجود بھارت کشمیر پہ اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں چین نے بھارت پر حملہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کشمیر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر سکتا تھا اور کشمیری عوام کی امنگوں کو پورا کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت کے صدر پاکستان جنرل ایوب خان نے ایک آبرومند قوم کے رہنما کی طرح مصیبت زدہ دشمن پر حملہ کرنا مناسب خیال نہ کیا (۶۶)۔ شاید اسی طرح کہ جب حد بندی کمیشن نے اپنا فیصلہ سنایا تو قائداعظم نے کہا تھا کہ

''اس عظیم اور خود مختار مملکت کی تعمیر میں ہمارے ساتھ سخت ناانصافیاں کی گئی ہیں، جہاں تک ممکن تھا ہم کو دبایا گیا ہے، اور ہمارے رقبے کو کم سے کم کیا گیا ہے، جو آخری ضرب ہم پر لگائی گئی، وہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ ہے۔۔۔ بہرحال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں لہذا ایک آبرومند قوم کی طرح ہمیں یہ قبول کر لینا چاہئے۔'' (۶۷)

مسلمان قوم بے شک ایک آبرومند قوم ہے۔ اس کے کچھ اخلاقی اصول ہیں جو نہ صرف اس کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ جنگ و جہاد میں بھی انہی اصولوں کی پاسداری کی جاتی ہے۔ لیکن اسلام اس کی حدیں بھی مقرر کرتا ہے۔ جب اللہ اور اس کے رسول کا دشمن، اسلام کے نام لیوا بے بس انسانوں اور مظلوموں کو آنکھوں کے سامنے قتل کر رہا ہو تو کیا قرآن جہاد کی تاکید نہیں کرتا؟ اسلام کا فلسفہ جنگ ہمیں جس قانون کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دیتا ہے اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے تمدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ اس نقطہ نظر سے احترام نفس کی صحیح ترین اور موثر تعلیم اسلام کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ قرآن نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے ہو، بلکہ وہ یہاں واضح طور پر قتال بالحق کا حکم دیتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یعنی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ریاست کی پوری مسلم اکثریت کو قتل و غارت گری اور جبری انخلا کے ذریعہ اقلیت میں بدلا جا رہا ہے اور ہندوؤں اور سکھوں کو دیگر علاقوں سے یہاں لا کر آباد کیا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہودیوں نے فلسطین میں کیا، کہ دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد

کیا اور اس مصنوعی آبادی کی بنا پر فلسطین میں اپنا استحقاق ثابت کر دیا۔ بھارت بھی اسی حکمت عملی پر کام کر رہا ہے۔ اگر کچھ اور عرصہ وہ اس حکمت عملی پر کام کرنے کا موقع حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو جائے گا کہ کشمیر میں استصواب رائے کروا دے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ اب اس علاقے میں اکثریت کس کی ہے اور ووٹ کس کے حق میں جائے گا۔

اس حقیقت کو ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ آج کے دور میں طاقت ہی سب سے بڑی سچائی ہے اور کسی قوم کے لئے اس کی اپنی طاقت کے سوا، اس کے حقوق کی حفاظت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ ان حالات میں یہ امید کرنا کہ کشمیر میں ہندوستان نے جو غاصبانہ دست درازیاں کی ہیں ان کا تدارک صرف حق اور انصاف کی بنیاد پر ممکن ہے، سراسر خام خیالی ہے۔ یہ ایک سہانا خواب ہے جو پاکستانی قوم نصف صدی سے دیکھ رہی ہے، اب اسے جاگ جانا چاہئے۔ اس کے سامنے ''جس کی لاٹھی اسی کی بھینس'' کی لاتعداد مثالیں ہیں۔ دور کیوں جایئے، صرف ایک ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس نے صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر بوقت تقسیم کتنے فوائد حاصل کئے اور مسلمانوں کی رواداری نے ان کو کس مقام تک پہنچایا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے پاکستان جنوبی ایشیاء کی ایک زبردست طاقت بن کر ابھرے۔ الحمدللہ آج پاکستان ایٹمی طاقت ہے۔ پاکستان کو خطے میں اپنی مضبوطی اور اہمیت کا اندازہ ہونا چاہئے، نیز اگر وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہو جاتا ہے تو کشمیریوں کو اس سے تقویت ملے گی۔ یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیر کو دیگر ریاستوں کی طرح بھارت کا تر نوالہ نہ بننے دے بلکہ اسے بھارت کے لئے گراں سے گراں تر بنادے۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا بھی فرض عین ہے، پاکستانی مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے۔

مراجع وحواشی

(۱) یہ مملکت رقبہ میں فرانس کے مساوی اور سوئٹزرلینڈ کی خودمختار ریاست سے پانچ گنا بڑی تھی۔ یہاں کی آبادی عراق، مصر، ایران اور افغانستان جیسے بڑے ممالک سے بھی زیادہ تھی۔ (ڈاکٹر عبدالحئی، ''مملکت آصفیہ'' ج ۱، ص ۴۳)

(۲) دائرہ معارف اسلامیہ، طبع اول، مادہ کشمیر، ج ۱۷، ص ۲۸۲، لاہور: دانشگاہ پنجاب، (۱۹۷۸ء)

(۳) مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ علاؤالدین خلجی پہلا مسلمان شخص تھا، جس نے دکن کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ اس وقت وہاں ہندو راجہ دیو رام حکمران تھا، وہ علاؤالدین خلجی کی شورش کا مقابلہ نہ کر سکا اور سر اطاعت خم کر دیا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۸، ص ۴۰۷، مادہ حیدرآباد)

(۴) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ کشمیر ص ۲۹۱

(۵) عقیل، معین الدین۔ ڈاکٹر، ''تحریک آزادی اور مملکت حیدرآباد''، ص ۸، کراچی، (۱۹۹۰ء) (۶) ایضاً، ص ۱۱

(۷) Keth, A. B. (1969). "A Constitutional History of India", New York, pp. 112-114

(۸) ۱۷۵۷ء کی مشہور جنگ پلاسی جس میں نواب آف بنگال سے ان کا علاقہ چھین لیا گیا (Robert P. F. (1958). "History of Birtish India" Oxford, p. 155)

(۹) ٹیپو سلطان کا ایک قول بڑا مشہور ہوا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے'' انہوں نے یہ کر کے دکھایا اور جب ان کو انگریزوں کے سامنے یکا و تنہا چھوڑ دیا گیا، گھر کے بھیدیوں نے دشمن کو تمام رازوں سے آگاہ کر دیا، تب بھی انہوں نے گیدڑ

کی زندگی گوارانہ کی اور تاریخ کے اوراق پر اپنا نام سنہری لفظوں میں لکھوالیا۔

(۱۰) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ پاکستان، ج۵ ص۳۸۸ تا۳۸۹ (۱۱) ایضاً

(۱۲) Metcalf, T. R. (1965), "The Aftermath of Revolt", Prinston, p. 223

(۱۳) اس وادی کی لمبائی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۸۴ میل ہے اور چوڑائی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف ۲۰ سے ۲۵ میل تک، رقبہ کم وبیش ۸۵۲۹ مربع میل ہے۔ یہ وادی سطح سمندر سے پانچ یا چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور نہایت زرخیز اور ہموار ہے (دائرہ معارف اسلامیہ، ج۱۷، ص ۲۸۲) ریاست جموں و کشمیر کی سرحدیں پانچ ممالک سے ملتی ہیں یعنی پاکستان، افغانستان، روس، چین اور بھارت۔

(۱۴) یہ ۱۵۸۶ء کی بات ہے جب مغل بادشاہ اکبر کے دورحکومت میں کشمیر مغل سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔جس سے مغل بادشاہوں کو ایک پسندیدہ تفریح گاہ میسرآ گئی ،مغلوں کے دور میں کشمیر نے بہت ترقی کی، جہانگیر نے یہاں کئی محل تعمیر کروائے اور کئی باغ بھی لگوائے اس نے ایران سے چنار کے درخت منگوا کر لگائے جو آج بھی کشمیر کا حسن اور اس کی پہچان ہیں۔شاہ جہاں نے بھی متعدد سرائیں تعمیر کروائیں اور باغ لگوائے ،شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ نے یہاں مشہور پری محل بنوایا جس کے کھنڈرات آج بھی سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں، اسی طرح اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بہت سی مساجد تعمیر ہوئیں۔

(۱۵) Jayapalan, N. (2000). " History of the freedom movement", India: New Dehli, p. 97

(۱۶) Birdwood, L. (1956). "The two Nations and Kashmir", London, p. 20

(۱۷) Tyndale-Biscoc, C. E. (1995). "Kashmir in sunlight and shade", p. 75

(۱۸) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ کشمیر،ص ۲۸۶ (۱۹) ایضاً

(۲۰) Lawrence, W. R. (1927). "The India we served", New York, p. 128

(۲۱) History of the freedom movement", p. 119 ولیم مورکرافٹ اور جارج ٹریبک دونوں سیاح لداخ سے ہوتے ہوئے کشمیر میں رنجیت سنگھ کے زمانے میں یہاں آئے اور یہاں کے حالات اپنے سفر نامے ''ٹریولز ان لداخ اینڈ کشمیر'' میں تفصیلی لکھے، یہ سفر نامہ دو جلدوں میں لندن سے شائع ہوا۔ (۲۲) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ کشمیر،ص ۲۹۵ (۲۳) ایضاً

(۲۴) مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے، فوق، محمد الدین، ''مکمل تاریخ کشمیر'' ج۱، لاہور، (۱۹۳۱ء)، یا ممتاز احمد، ''مسئلہ کشمیر''، لاہور (۱۹۷۰ء)، یا صفدر محمود، ''پاکستان افئیر''، لاہور، (۱۹۷۰ء)

(۲۵) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ حیدرآباد۔۱۹۳۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق پورے حیدرآباد میں ۲۷۱۴۳ منادر، ۵۱۹۱ مساجد اور ۱۱۰ چرچ تھے۔ یہ اعداد وشمار نہ صرف وہاں کی آبادی کا تناسب ظاہر کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کی مذہبی رواداری کا بہترین مظہر بھی ہیں۔

(۲۶) حسین سید، ''زوال حیدرآباد''، ص۲۵، حیدرآباد، (۲۰۰۱ء)

(۲۷) میسور اور سرنگاپٹم یہ دونوں علاقے پہلے نظام حیدرآباد کے باجگزار تھے،لیکن جب آصف جاہ دوم کی حکومت تھی تو یہ دونوں علاقے خود مختار ہوگئے یوں نظام دکن یہاں کے حکمران کو اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔

(۲۸) ''ہسٹری آف ماڈرن دکن'' ص۹۹ تا ۱۰۰ (ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد) (۲۹) حسین سید، ص ۲۴

(۳۰) ایضاً،ص ۲۶ (۳۱) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ حیدرآباد، ج۸،ص ۲۹

(۳۲) ہاشمی، فرید آبادی ''تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت''، ج۲،ص ۳۳۰ تا ۳۴۴ (۳۳) ایضاً

(۳۴) دائرہ معارف اسلامیہ، ج۸،ص ۴۹

(۳۵) Plilips, C. H. (1965). "The evolution of India & Pakistan 1853-1947", London, p. 428

(۳۶) عقیل، ص ۱۴

(۳۷) مجلس اتحاد المسلمین، ۹ نومبر ۱۹۲۷ء کو مسلمانان حیدرآباد میں سیاسی تنظیم کی حیثیت سے نمائندگی، مرکزیت اور بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس کے قیام کے پس پشت زیادہ تر مذہبی محرکات روبہ عمل رہے، لیکن معاشرتی اسباب بھی خاصے قوی تھے۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس آریا سماج نے شدھی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا مجلس کا قیام اسی لیے عمل میں آیا کہ وہ شدھی تحریک کی مدافعت میں تمام فرقوں کو متحد کرے۔ اتحاد المسلمین کے پیش نظر حیدرآباد کی آبادی کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا تھا، چناچہ پیرامونٹیسی کی جتنی شدید مخالفت حیدرآباد میں ہوئی، ہندوستان کی کسی ریاست میں نہ ہوئی۔

(۳۸) Hodson, H. V. (1969). "The great divide", London, p. 31

(۳۹) Sitaramayya, B. P. (1946). "The History of the Indian National Congress: 1885-1935", Vol 2, Bambai, p. 79

(۴۰) Moore, R. J. (1947). "Crises of Indian Unity", Oxford, p. 275

(۴۱) Hodson, H. V. p. 148

(۴۲) Hassan, K. S. (1966). "Docoments of the foreign relation of Pakistan, The Kashmir Question", Karachi, p. 11

(۴۳) عقیل، ص ۲۳ تا ۲۴　(۴۴) حسین سید، ص ۱۰۴　(۴۵) Hassan, K. S. p. 42　(۴۶) ایضاً

(۴۷) ایضاً　(۴۸) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ کشمیر، ص ۲۹۷　(۴۹) ایضاً، ص ۲۹۶

(۵۰) معروف برطانوی محقق ایسٹر لیمب اپنی کتاب "Birth of a tregedy,Kashmir 1947" میں کشمیر کے بھارت سے الحاق کو چیلنج کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''چونکہ تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے لہذا وقت کے ساتھ ساتھ ایک سنگین بد دیانتی پر سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے اور پنڈت نہرو کی جموں وکشمیر کے وزیر اعظم کے ساتھ خط وکتابت کے مطالعہ سے کسی شک کی گنجائش کے بغیر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بھارت کے ساتھ جموں وکشمیر کے الحاق کی دستاویزات جعلی ہیں۔ مکمل تفصیلات کے لیے دیکھئے یہی کتاب، صفحات ۸۱ تا ۱۰۳

(۵۱) ایضاً　(۵۲) ارشاد محمود، ''مسئلہ کشمیر کے امکانی حل''، ص ۱۳، اسلام آباد، (۱۹۹۷ء)

(۵۳) شکیب بدر، ''حیدرآباد کا عروج وزوال''، ص ۹۲، کراچی، (۱۹۶۴ء)

(۵۴) Menon, V. P. (1956). "The story of the Integration of the Indian State", India, p. 327

(۵۵) حسین سید، ص ۱۲

(۵۶) عبدالحئی، محمد، ''مملکت آصفیہ''، ج ۲، ص ۵۲۱، کراچی، (۱۹۸۶ء)

(۵۷) میر لائق علی اس وقت حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے اور نظام نے ان کو ریاست کی انتظامی کونسل کا صدر بھی مقرر کیا تھا۔

(۵۸) خان، مشتاق احمد، ''کاروان حیات''، ص ۲۰۰، لاہور، (۱۹۷۴ء)　(۵۹) ایضاً

(۶۰) لائق علی، میر، ''ٹریجڈی آف حیدرآباد''، کراچی، (۱۹۶۲ء)　(۶۱) ایضاً

(۶۲) عزیز، ایم۔اے، ''پولیس ایکشن''، ص ۵۱، اورنگ آباد، (جون ۲۰۰۶ء)　(۶۳) ایضاً، ص ۵۲

(۶۴) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ کشمیر، ص ۲۹۹　(۶۵) ایضاً　(۶۶) ایضاً

(۶۷) دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ پاکستان، ج ۵، ص ۳۹۰